Volume 03, Issue 01,
January-March 2025
PP: 191-196
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

مشرقی نقاد اور مغربی تھیوریز: اُردو ادب کے لیے مفید یا مضر

Eastern Critics and Western Theories: Beneficial or Harmful for Urdu Literature?

Dr. Mustansar Hussain Jami[1], Dr. Mehmood ul Hassan[2]*

Article History

Received
12-03-2025

Accepted
29-03-2025

Published
30-03-2025

Indexing

Abstract

The application of Western literary theories in Urdu literature has sparked a critical debate regarding their relevance, suitability, and cultural alignment. This paper argues that these theoretical frameworks, deeply rooted in Western intellectual traditions, fail to capture the essence of Urdu literary thought. The philosophical, historical, and socio-cultural contexts that shaped Western literary theories differ significantly from those that have influenced Urdu literature. As a result, imposing these foreign analytical models on Urdu literary works often leads to misinterpretations and a disregard for indigenous literary values.

Moreover, the dominance of Western critical paradigms has overshadowed the rich tradition of indigenous literary criticism in Urdu. This trend has not only marginalized the contributions of native critics but also created an intellectual dependency on borrowed methodologies that do not fully address the nuances of Urdu literary expression. Instead of following Western approaches, this study advocates for a revival and recognition of indigenous literary criticism, emphasizing the need to develop analytical frameworks that resonate with the spirit of Urdu literature. By exploring the contributions of prominent Urdu literary critics and theorists, this paper underscores the necessity of fostering a culturally grounded literary discourse. The study concludes that a more authentic and contextually relevant approach to Urdu literary criticism must emerge from within its own intellectual traditions, ensuring that the literature is analyzed and appreciated on its own terms rather than through external lenses.

Keywords:

Urdu Literary Criticism, Western Literary Theories, Eastern Critics, Literary Analysis, Role of Critics, Theoretical Frameworks.

[1] *Assistant Professor, MY University, Japan Road, Islamabad. dr.mustansarhussain@myu.edu.pk*
[2]*Assistant Professor, Urdu Department, National University of Modern Languages, Islamabad. mhhassan@numl.edu.pk.* ***Corresponding Author***

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

اُردو کے محققین کا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ سائنسی علوم سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں سوائے معدودِ چند کے اور جو لسانیات کے اساتذہ ہیں وہ بھی صرف لسانیات کی حد تک سائنس کو جانتے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کچھ خاص اصطلاحات اور عوامل کو رٹ لیتے ہیں جس سے باہر زندگی بھر نہیں نکل پاتے لیکن یہ بات بھی داد کے قابل ہے کہ کچھ تو ہیں جو لسانیات جیسا دقیق مضمون سمجھ کر طلبا تک پہنچاتے ہیں۔ سائنس بذات خود ایک مشکل علم ہے اور پھر زبان کا سائنسی مطالعہ مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ زبان جس کے ذمہ دار ادیب، مصنف، شاعر خود کو سمجھتے ہیں لیکن لسانیات جیسا مضمون اُن کے بس سے باہر کی بات لگنے لگتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ زبان پر دسترس رکھنے کے باوجود ادیب، مصنف اور شاعر لسانیات کے پیچیدہ اصول وضوابط اور اصطلاحات سے ناآشنائی کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے خیال سے لسانیات کا علم ادب کے طلبا کے لیے بالکل بھی ضروری نہیں۔ اس کا علم نفسیات، بشریات، مصنوئی ذہانت اور سماجیات کے ماہرین کے لیے ناگزیر ہونا چاہیے تھا نہ کہ ادب کے طلبا اور اساتذہ کے لیے۔ اُردو کے طلبا کو کہاں افسانہ پڑھتے ہوئے اعضاء صوت یاد رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے یا لسانیات کی اقسام سے پالا پڑتا ہے۔ ایک مسئلہ جو اُردو ادب کے طلبا کے لیے کسی آگ کے دریا سے کم نہیں اور انھیں اس میں سے ہر صورت گزرنا پڑتا ہے یہ آگ کا دریا وہ مغربی تھیوریز ہیں جنھیں ادب پر مسلط کر دیا گیا ہے اور ہر خاص وعام کو انہیں قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ نقاد معاشرے میں اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن اگر کوئی ادیب اور مصنف سے مخاصمت کی بنیاد پر منصوبہ سازی سے ایسی تھیوریز مستعار لے کر پیش کرے اور کسی ادیب، مصنف یا شاعر کے کلام یا فن پارے کو ترجمہ شُدہ تھیوریز کے زیر اثر اچھا یا بُرا کہہ کر اُس کے مقام ومرتبے کا اندازہ لگائے، میرے خیال سے یہ بہت بڑی ناانصافی ہو گی۔

نقاد کا کام ہوتا ہے کہ کسی بھی فن پارے کے معائب ومحاسن اعوام کے سامنے رکھے، نہ کہ متعصبانہ رویہ روا رکھتے ہوئے ایسی تھیوریز مستعار لے کر آئے جن سے اُس فن پارے کی ہئیت، خیال، فنی وفکری اُسلوب اور کہانی پر اعتراضات کی نشتر زنی کر کے عوام الناس میں بجائے مصنف اور شاعر کے خود کو زیادہ مقبول اور مضبوط ثابت کر دے۔ میرے خیال سے نقاد کے لیے ضروری شرط ہونی چاہیے کہ وہ خود ادیب ،مصنف یا شاعر ہو جیسے کسی بھی مضمون کو پڑھنے یا پڑھانے والا ہی اُس مضمون پر تنقید کا حق رکھتا ہے مثلاً کیمسٹری یا فزکس پر انہی مضامین کا ماہر اپنی رائے دینے کی اہلیت رکھتا ہے اسی طرح مصوری یا موسیقی پر تنقید کا حق بھی صرف مصور یا موسیقی کے استاد کو ہے۔ لیکن ادب کے معاملے میں یہ سب اُلٹ ہو جاتا ہے کوئی مصوری کی تحریک کے زیر اثر ادب کو جانچنے کی کوشش کرتا ہے تو کوئی بشریات، نفسیات اور سائنس کے ذریعے ادب کا تجزیہ کرتا ہے آخر ان کو کس نے اجازت دی ہے کہ وہ لوگ یہ سب کریں، اگر وہ کرنا بھی چاہتے ہیں تو اپنی معلومات کے اضافے کے لیے کریں لیکن اُردو کے اساتذہ کو کیا ہو گیا ہے جو ان مغربی تھیوریز جن کا تعلق مصوری سے ہے انہیں غلط سلط سمجھ کر یا ترجمہ پڑھ کر اُردو ادب پر نافذ کرتے جا رہے ہیں۔ غیر فطری نقاد اور اُس کی تنقید پر ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے ملاحظہ کریں:

> "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا فن کار نقّاد بن جاتا ہے۔ پیشہ ور نقّادوں پر، جو اتفاق سے ادبیات کے استاد بھی ہوتے ہیں، یہ پھبتی اس لیے بھی ضرور کسّی جانی چاہیے کہ وہ جو کچھ کلاس روم میں پڑھاتے ہیں وہی اپنے مضامین میں لکھ دیتے ہیں۔ میں تنقید کی اس قسم کو نصابی تنقید کا نام دیتا ہوں۔ تنقید کے لیے جیسا کہ ایلیٹ نے کہا ہے باخبری بنیادی چیز ہے۔ یہاں شعور کی سطح واضح ہوتی ہے۔ فکر اور اس کے وہ بنیادی مسائل اہمیت رکھتے ہیں جن پر ادب کی بنیاد قائم ہے اور جن سے معاشرہ کی

تہذیبی روح قوت حاصل کرتی ہے۔ "فکری تنقید" کے بغیر آج کا ادب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ میں ادب میں ادبی تنقید کے ذریعہ وہ کام انجام دینا چاہتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں انجام دے چُکا ہوں۔ جو ایک زمانہ میں ادب اور فلسفہ الگ الگ انجام دیتے تھے۔ اسی لیے میں اس تنقید کو جو فکر سے عاری ہے، جس میں زندگی کے مسائل ادب کے تعلق سے سمجھنے کی شعوری کوشش نہیں ملتی، ادب کے دائرہ سے بھی خارج سمجھتا ہوں۔"[1]

اُردو میں کچھ تھیوریز تو مستعمل ہیں لیکن چند ایسی ہیں جن کا دور دور تک ادب سے کوئی تعلق نہیں بنتا اور خاص طور پر اُردو ادب سے۔ مثال کے طور پر مصوری کی کتنی ایسی تھیوریز ہیں جن کو ادب میں نافذ کر دیا گیا ہے۔ انگریزی اور اُردو ادب میں ہمیں فرق کرنا پڑے گا وہاں کے ماحول، تہذیب و ثقافت، ادبی پس منظر اور زبان کی قدامت، آزادی رائے، ترقی کی رفتار کو سمجھے بنا ہم کیسے مغرب کو مشرق پر مسلط کر سکتے ہیں۔ مغربی اصناف کو اُردو میں شامل کرنا کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے کیونکہ زندگی کی کہانی ہی بیان کرنی ہے، وہ چاہے داستان میں ہو، افسانے میں ہو یا ناول میں۔ لیکن اُن کی تھیوریز کو ادبی اصناف پر مسلط کرنا یہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ اُس معاشرے کی بنیادیں پانچ سو سال سے بھی زائد پر مشتمل ہیں، اُس معاشرے کے لوگوں نے دنیا میں سائنسی ایجادات سے تہلکہ برپا کر دیا تھا، اُس معاشرے میں جو اخلاقیات، قانون، جمہوریت، علم و دانش کے خزانے موجود ہیں یا اہل علم موجود ہیں مغرب اب مریخ پر پہنچ چُکا ہے جبکہ ہم سے لاہور سے راولپنڈی تک تیز رفتار ٹرین نہیں بنائی جا سکی تو کیسے وہاں کے پیچیدہ ترین ذہنوں کی اختراع کردہ یا تشکیل شُدہ تھیوریز کو ہم اپنے ادب پر نافذ کر سکتے ہیں۔ مغرب اور وہاں کے نقاد کا نکتہ نظر اور بصیرت کیا ہمارے نقاد کے پاس ہے؟ کیا ہمارا نقاد مصوری، نفسیات، فلسفہ، بشریات، سماجیات اور سائنس کو اُس حد تک سمجھتا ہے جتنا مغربی نقاد شعور رکھتا ہے؟ تھیوری اپلائی کرنا اور تھیوری کی تشکیل کرنا دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کی بڑی مثال یہ ہے کہ بیس سال سے مغرب میں کوئی نئی تھیوری پیش نہیں کی گئی تو ہمارے یہاں بھی کسی نئی تھیوری کے ترجمے کی بازگشت ہم نے نہیں سنی اور نہ ہی درجنوں میں پاک و ہند میں باشعور نقادوں نے ابہام شُدہ ترجمے کے دفتر شائع کیے ہیں۔ مغرب میں تھیوری اُس وقت کے منظر نامے کے مطابق یا مستقبل کی پیش گوئی کے طور پر تشکیل پاتی ہے۔ مغرب میں تھیوری کے تحت متون وجود میں آتے ہیں وہاں کا قاری اس تھیوری، اُس وقت کے منظر نامے، متن، مصنف کی سوچ اور نقاد کے کردار میں مماثلت دیکھتا ہے اور بات سمجھ جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں صنف مغربی ہوتی ہے کردار مشرقی، تکنیک مغربی، کہانی مشرقی، اسلوب ملاوٹ شدہ، پیغام مبہم اور نقاد تمام تر صورتحال سے ناواقف، جب یہاں کا قاری وہ فن پارہ یا تنقید پڑھتا ہے تو اُسے اپنے ماحول سے مماثل نہیں کر پاتا۔ مصنف اور کہانی کو پھر بھی کسی حد تک سمجھ کر حظ اُٹھاتا ہے لیکن نقاد کی مستعار لی گئی تنقید اُس کے پلے نہیں پڑتی اور وہ نقاد کو یکسر مسترد کر دیتا ہے۔ کیوں کہ ہمارا نقاد اور اُس کی مستعار لی گئی تھیوری ہمارے ماحول سے غیر فطری ہیں۔ اس لیے آج کل ایک ہی بات ہمارے ادبی حلقوں میں زیر بحث ہے کہ ہمارے معاشرے سے نقاد غائب ہو چُکا ہے۔ غائب تو ہونا ہی تھا کیوں کہ اُس کی تنقید غیر فطری تھی۔ وہ نہ تو ہمارے معاشرے سے تعلق رکھتی تھی نہ ہی اُس کے نتائج سے ہمیں کوئی فائدہ یا نقصان ہو سکتا تھا۔ اب اگر میں بات کروں حالیؔ، آزاد اور شبلی کی تو اُن کی تنقید آج بھی زندہ ہے کیوں کہ وہ فطری تنقید تھی۔ اس تنقید کے اثرات ہمارے معاشرے پر براہ راست پڑے۔ آج کئی دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی قاری حالیؔ کے مقدمہ شعر و شاعری کو پڑھتا ہے تو وہ شعر میں تخیل، معنی، الفاظ کے چناؤ کو اپنے سامنے ہوتا دیکھتا ہے ان

خصوصیات کو شاعروں کے کلام میں محسوس کرتا ہے۔اور حالیؔ کو آج کے ہر بڑے نقاد سے بہتر سمجھتا ہے۔حالیؔ کا مقام و مرتبہ کا اندازہ گوپی چند نارنگ کے دیباچہ میں تحریر ان سطروں سے لگایا جاسکتا ہے:

"اُردو میں تھیوری یعنی ادبی نظریہ سازی کی پہلی باضابطہ کتاب حالی کا مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ یوں تو شعریات کا احساس پہلے سے موجود چلا آتا تھا، لیکن اسے منضبط کرنے کی اوّلین کوشش حالی ہی نے کی"[2]

اب اگر ہم مستعار لی گئی تھیوریز کا محدبانہ (غور سے) جائزہ لیں تو کیا ساختیات(Structuralism)، پس ساختیات(Post Structuralism)، فیمینزم(Feminism)، جدیدیت(Modernism) اور مابعد جدیدیت(Postmodernism) وغیرہ نے ہمارے ادیب، قاری اور ادب پر کوئی اثر پیدا کیا ہے؟ تو اس کا بڑا سادہ سا جواب ہے کہ نہیں۔۔۔!! سوائے ابہام در ابہام پیدا کرنے کے۔ڈاکٹر وزیر آغا ساختیاتی تنقید کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ساختیاتی تنقید پر ان کے علاوہ بھی بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں مثلاً ایک یہ کہ اس نے ادبی کے بجائے سائنسی طریق اختیار کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس نے لفظی بازی گری کا مظاہرہ کیا ہے۔ تیسرا یہ کہ اس کا انداز میکانکی ہے۔ چوتھا یہ کہ اس نے مصنف کی نفی کر کے قاری کو تمام تر اہمیت دے دی ہے۔ آخری یہ کہ اس نے تنقید کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔"[3]

البتہ کچھ تھیوریز ایسی ہیں جو کسی قدر مستعمل ہیں اور ان پر کام کرنا بھی چاہیے جیسے تقابلی ادب(Comparative Literature)، جمالیات(Aesthetics)، اور علامت نگاری(Symbolism) وغیرہ موآخر الذکر تھیوریز پر اگر غور کیا جائے تو یہ کسی نہ کسی صورت میں پہلے ہی سے اُردو ادب میں چلی آتی ہیں۔ تقابل ہی کو لے لیں مولانا شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف "موازنہ انیس و دَبیر"، پیغمرانِ سخن (میرؔ، غالبؔ، کبیرؔ) علی سردار جعفری، "ٹیگور اور اقبال" عارف بٹالوی، قصہ کوتاہ اُردو میں افسانوی ادب و غیر افسانوی ادب میں تقابل کی کئی اور مثالیں مل جاتی ہیں۔اس لیے تقابلی تنقید(Comparative Literature) آج بھی قابل عمل تصور کی جاتی ہے۔ تقابلی تنقید سے اخذ ہونے والے نتائج اُردو کے طلبا اور اساتذہ کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کے لیے بھی مفید ثابت ہوئے ہیں۔اب اگر بات کی جائے جمالیات(Aesthetics) کی تو یہ بھی ایک ایسا تنقیدی اور تخلیقی شعبہ ہے جو ابتدائی دور سے ہی اُردو ادب کا خاصہ رہا ہے۔ میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، علامہ محمد اقبالؔ، فیض احمد فیضؔ کی شاعری میں کیا جمالیات کا بیان نہیں ہے؟ جی ہاں ہے اور بہت خوب ہے میرؔ کی شاعری میں محبت، فطرت اور انسانی جذبات کا جمالیاتی بیان جبکہ مرزا غالبؔ کے یہاں حسن کے مجرد تصور کا فلسفیانہ بیان ملتا ہے فیضؔ اپنی شاعری میں حسن و عشق کے سماجی حقیقتوں میں تلاش کرتے ہیں اور علامہ اقبالؔ جمالیات کو اسلامی فلسفہ اور خودی کے تصور، کائناتی حقائق اور فطرتی عناصر سے تعمیر کرتے ہیں۔ناصر کاظمی، احمد فرازؔ، منیرؔ نیازی اور پروین شاکر کی شاعری میں بھی جمالیات بڑے اچھوتے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ نثر کی بات کریں تو داستانوی ادب میں جمالیات کا ایسا بیان دیکھنے کو ملتا ہے کہ جس کی نظیر ڈھونڈنا مشکل ہے۔ان داستانوں میں جادوئی عناصر، لکھنوی تہذیب، باغات، لباس، تمدن، موسیقی، نسوانی حسن اور رقص وغیرہ کے ذریعے جمالیاتی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ رہی بات علامت نگاری(Symbolism) کی تو ہماری شاعری اور نثر کا علم بیان یا علامت کے بغیر تصور کرنا محال ہے یا ناممکن ہے۔

فرق بس اتنا ہے کہ ان کے نام مغربی تھیوریز سے متاثر ہو کر نئے رکھ دیے گئے ہیں یہ پہلے بھی ہمارے ادب کا حصہ تھیں اور آئندہ بھی رہیں گی کیوں کہ یہ ہمارے ماحول اور ہمارے ادب سے گہرا امتزاج رکھتی ہیں اور فطری ہیں نہ کہ مغربی تھیوریز کی طرح غیر فطری فلسفہ لیے ہمارے ادب پر مسلط ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اُردو ادب کو مغربی تھیوریز سے دور رکھنا چاہیے ؟ جی نہیں آپ اُن تھیوریز کو بطور کیس اسٹڈی ضرور پڑھیں سمجھیں اور طلبا کو سمجھائیں، پڑھائیں لیکن خدارا ان کا اطلاق ہمارے فن پاروں پر نہ کریں۔ ادب عالیہ، عالمی کلاسکس کو پڑھنا بے حد ضروری ہے ان کا تقابل اُردو ادب کے لیے کسی تازہ ہوا کے جھونکے کی صورت ہے۔ ولایتی اوزاروں سے مشرقی کوزہ گری تو کی جاسکتی ہے لیکن مشرقی اوزاروں سے مغربی کوزے بنانا نہ صرف اپنے ہنر کو برباد کرنے بلکہ اپنی روایات کو معدوم کرنے کی طرف آخری قدم ہو گا۔ سوال ایک اور یہ بھی ہے کہ پھر اُردو میں سندی تحقیق کے لیے کیا طریقہ اپنایا جائے جس سے ادبی فن پاروں کو پرکھا جاسکے اور سندی تحقیق کے لوازمات بھی پورے ہو جائیں۔ آپ ادبی فن پاروں کا تقابل کیجیے، اُن کا اپنے کلاسیکی ادب سے موازنہ کیجیے۔ آپ کسی شاعر کی شاعری میں تہذیبی، ثقافتی، مذہبی، تمدنی اور فلسفیانہ عناصر تلاش کر سکتے ہیں یا شاعری کے اصولوں پر اُسے پرکھ سکتے ہیں۔ آپ شاعر کے مافی الضمیر کو تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کسی بھی ادبی فن پارے میں مستقبل کے اشارے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ آپ طلبا کو خاص موضوعات پر افسانہ یا ناول یا چند نظمیں، غزلیں، ڈرامہ لکھنے کا کام دے سکتے ہیں جو تخلیقی بھی ہو گا اور تحقیقی بھی۔ آپ اسکالرز سے کسی بھی ادبی فن پارے کا مقام و مرتبہ حالیؔ، آزادؔ اور دیگر صاحب کمال کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق طے کرنے کا کام کرواسکتے ہیں۔ آپ اسکالرز سے کسی سیاحتی مقام کا سفر نامہ لکھوا سکتے ہیں۔ جب سائنس میں پی ایچ ڈی کے لیے نئی ایجادات کو سراہا جاتا ہے تو اُردو ادب میں نئے فن پاروں کو کیوں نہیں سراہا جاتا۔ قصہ مختصر میں چاہتا ہوں کہ اسکالرز سے تخلیقی اور تحقیقی ایسا کام کروایا جائے جو اُردو ادب میں فطری تقاضوں کے عین مطابق ہو جس سے اُردو ادب میں نئے تجربات ہوں، سائنسی طرز پر فن پارے تخلیق ہوں اور ہم اپنے ادب کو عالمی ادب کے مدمقابل کھڑا کر سکیں لیکن اپنے اصولوں، رواجوں، ثقافتوں، تہذیبوں اور ماحول کے مطابق جس میں ہمارے ہی معاشرے کی جدید صورت کا عکس ہو جسے ہم پہچان بھی سکیں اور فخر سے پیش بھی کر سکیں۔ علامہ اقبال کی مثال لیجیے کہ کس طرح علامہ نے اپنی مغرب شناسی اور مغربی علوم وفیوض کو مشرق میں نہ صرف منتقل کیا بلکہ اسلامی روایات کو بھی ساتھ لے کر چلے اور یہ سب کرتے ہوئے ان کا کام کہیں سے بوسیدگی، قنوطیت یا بوجھل پن کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اُن کی تصنیفات میں وہ آفاقیت پائی جاتی ہے کہ یورپ میں اُس کی گونج واضح سنی جاسکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> "اقبال اس سے ہرگز مرعوب نہ ہوئے تھے جیسے کہ سرسید اور مولانا حالیؔ ہو گئے تھے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ سرسید نے مغربی تہذیب کو ایک بالکل سرسری نگاہ سے دیکھا تھا اور حالیؔ نے سرسید کی نگاہوں سے اس کی ایک جھلک پائی تھی۔ مگر اقبال کی طرح ان لوگوں نے نہایت قریب سے مغربی تہذیب کی عمارت کو لرزتے اور ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس نظارے نے اقبال کے ہاں خود اعتمادی پیدا کی اور وہ مغرب کی عام روش سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ تراشنے پر مائل ہوئے اس نئے فکری اسلوب میں اقبالؔ نے اولاً سخت کوشی کی ضرورت پر زور دیا ثانیاً مسلمانوں کے دور زرّیں سے وہ مثالیں فراہم کیں جو اس سخت کوشی کی اصل ماہیت کو بیان کرنے کے لئے بہت مفید تھیں، ثالثاً انھوں نے لہجے کی انفعالیت ترک کر کے ایک بلند آہنگ اور گمبھیر لہجہ اختیار کیا۔ رابعاً

اسالیب بیان میں ایک طرح نو کا اہتمام اس طور کیا کہ پٹی ہوئی اور پامال لفظی تراکیب، بندشیں، استعارے اور تشبیہیں از خود متروک ہو گئیں اور ان کی جگہ لفظ کو ایک نئے تخلیقی رنگ میں استعمال کرنے کا رویہ پیدا ہو گیا۔ خامساً اقبال نے اردو ادب کو طوائف کے کوٹھے اور دربار کی گھٹی ہوئی اور متعفن فضا سے نجات دلا کر اس میں ایک انوکھی فکری گہرائی سمودی نیز ادب کے دامن کو اس قدر وسیع کر دیا کہ اس میں متعدد علوم سے اخذ کردہ افکار ایک فطری انداز میں جذب ہوتے چلے گئے۔ گویا ایک فکری پھیلاؤ اقبال کی تحریک کا سب سے بڑا ثمر تھا اور دراصل اسی ایک عنصر نے اقبال کے بعد ابھرنے والی تحریکوں کو متعدد سمتوں سے متاثر کیا اور آج تک کر رہا ہے۔"[4]

علامہ کی سوچ اور عمل سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ کیسے ہم نے مغرب کے علمی طوفان کا نہ صرف مقابلہ کرنا ہے بلکہ ان علوم کو اپنے اندر جذب کر کے کس طرح اپنے لوگوں تک پہنچانا ہے اس کی عملی صورت انھوں نے اپنی تصانیف میں پیش بھی کی ہے لیکن ہماری کمبختی کہ ہم مغربی تھیوریز کی رو میں ایسے بہے کہ بہتے ہی چلے گئے اور تمام تر روایات کو بھول کر مغربی لبادہ اوڑھے دنیا میں خود پر فخر کرنے لگے۔ لیکن اس سارے عمل میں ہم کہاں تھے اور ہمارا اپنا ادب کہاں تھا۔ علامہ اقبال کو اس لیے دنیا تعظیم کی نظر سے دیکھتی ہے اور انھیں قابلِ تقلید سمجھتی ہے کیوں کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن سے جڑے رہے اور اپنی خودی کو بھی برقرار رکھا۔ اس لیے ہمیں بھی چاہیے کہ مغربی ادبی تھیوریز کو پڑھیں، سمجھیں اور اُن سے جتنا ہو سکتا ہے اُتنا مستفید بھی ہوں لیکن اُنھیں اپنے ذہنوں پر اتنا سوار نہ کر دیں کہ ہمارا اپنا ادب ہمیں چھوٹا لگنے لگ جائے۔

حوالہ جات:

[1] جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تنقید اور تجربہ"، (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1989ء)، ص:10، 11۔

[2] گوپی چند نارنگ، "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات"، (قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، 2004ء)، ص:9۔

[3] وزیر آغا، ڈاکٹر، "تنقید اور جدید اُردو تنقید"، (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011ء)، ص:98۔

[4] وزیر آغا، ڈاکٹر، "نئے تناظر"، (اُردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد، 1979ء،) ص:57۔